ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July - September)

Psychological Analysis of Symbolic Character "Bird" in Majeed Amjad's poems

مجید امجد کی شاعری میں پرندے کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ

Afshan Jabeen [1]

Safdar Ali Shah [2]

Humaira [3]

Abstract: As far as the modern Urdu poetry is concerned, Majeed Amjad is widely regarded as a multi-faceted, universal and leading poet. In this article, an attempt has been made to examine and x-ray the psychological and cultural dimensions of his characters inspired by and taken from nature. Majeed Amjad has created a magnificent pageant of characters using the phenomena of nature as his ultimate inspiration and muse. And thereby he has interpreted the obvious and hidden aspects of life in such a manner that makes us realize that nature is and inexhaustible and incredible treasure trove of sympathy, love, freedom, struggle for survival and knowledge and wisdom. Majeed Amjad, as if to very profound psychological evolution, is completely lost in his characters. His poetry affords us an everlasting and ever-relevant lesson that we can be eternally in touch with the Higher Reality only by living in the very heart of nature and by living in perfect harmony with nature.

بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور سائنس کی ایجاد نے درختوں کو کاٹ کاٹ کر جنگلات کو نہ ہونے کے برابر کر دیا۔ درخت سے تعلق رکھنے والے پرندے (Domestic Birds) بننے پر مجبور کر دیا اور یہی پرندے اپنی نسل کی بقا میں دوسروں سے آگے ہیں۔ انسان کے ساتھ شہروں اور گھر گھر میں سے رزق حاصل کرنے والے پرندے اب نئے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔

مجید امجد نے نظم ''پکار'' (۸۔۱۹۵۸) میں ہندوستان کے مقامی پرندے لالی کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ یہ کردار مکمل فعال صورت میں ابھرا ہے جو نئی شہری صورتحال میں چچلاتے ہوئے، اڑتے ہوئے مڑ کر بجلی کے تار پہ آ بیٹھی ہے جو کہ اس کے لیے موت کا پیغام ہے۔ شاعر کا حساس دل اس صورتحال میں کرب کے احساس سے نقارے کی طرح چیخ اٹھا ہے۔ اس لالی نے پرندہ ہونے کے باوجود انسانی محسوسات کی زبان سن کر موت کا جھولا جھولنا بند کیا اور بامِ اجل سے اڑ گئی۔ پرندے کا یہ کردار فطرت کے قریب ہے اس لیے وہ انسان کے لطیف احساسات کی پکار پہ لبیک کہتا ہے اور موت کے پنجے سے نکل کر زندگی کی طرف اڑ جاتا ہے لیکن انسان جو فطرت سے دور جا چکا

[1] Lecturer Department of Urdu Malakand University at Afshanjabeen644@gmail.com

[2] Assistant Professor in Urdu at Govt College Ghazi District Haripor KPK at-safdarashah7@gmail.com

[3] Assistant Professor Department of Urdu Islamia Collage Peshawar at - Zari39@yahoo.com

ہے اپنے علم و سائنس کی بدولت اتنا اسلحہ جمع کر چکا ہے جو اس کے لیے انگارے یعنی ہلاکت ہے اور اس ہلاکت پہ بیٹھ کر بھی وہ مستقبل میں راحت کی زندگی یعنی پھولوں کا تمنائی ہے۔ اس کے اندر روحانی اقدار کے لطیف احساسات ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے حساس شاعر کی زندگی بھری پکاریں اس کے لیے بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ یوں اس نظم میں لالی کا یہ کردار جدید دور کے انسان کے لیے ایک ناصح کی صورت میں ابھرا ہے۔ جو اسے فطرت یعنی زندگی کے قریب ہونے کی دعوت فکر دے رہا ہے جو کہ جدید تہذیب میں انسان کہلانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اگر وہ انسان ہوتا تو مجید امجد کی آواز اس کے دل تک ضرور پہنچ جاتی اور مجید امجد کے انوکھے مگر حقیقت سے بھرے رازوں کو سمجھ کر تہذیبی ورثے کا امین ہوتا۔ اسی حقیقت کا انکشاف انھوں نے اپنی ایک نظم ''بن کی چڑیا'' میں بھی کیا ہے۔ یہاں شاعر کا کردار چڑیا کے ساتھ اپنے آپ کو مشخص کر کے پیش کرتا ہے جس کے لیے پورا معاشرہ بہرہ بن چکا ہے۔ یہ آواز معاشرے تک ہی محدود نہیں۔

ان اشعار پر غور کیجیے:

کون سنے، ہاں کون سنے، راگ اس کے راگ البیلے

سب کے سب بہرے ہیں .... میداں، وادی، دریا، ٹیلے

ظالم تنہائی کا جادو ویرانوں پر کھیلے!

دور سرابوں کی جھلمل روحوں پر آگ انڈیلے!

نوک نوک خار کھلنڈرے ہرنوں کو کلپائے!

(1) گانے والی چڑیا اپنا راگ الاپے جائے

شاعر نے کیوں کہ شدید تنہائی کے کرب کی بدولت اپنے داخل کی کائنات کو اپنے خارج کی کائنات سے ملا دیا ہے۔ اس لیے وہ ایک پرندے کے ۱کردار میں ڈھل کر اپنی آواز (چیخ) کو لالی تک پہنچا سکتا ہے۔ لیکن انسانی رشتوں کی آپس میں اتنی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے کہ اپنے جیسے انسانوں ہونے کے باوجود بھی ایک دوسرے کی آواز کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورتحال میں شاعر کسی اور سمت کی طرف اڑان کرنا چاہتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عامر سہیل:

نظم کے آخر میں ایک آواز ہے جو ''بن کی چڑیا'' میں الاپ کی شکل میں تھی مگر یہاں ایک چیخ کی صورت میں '' ہے مگر یہ چیخ بے سود پکار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یقینا دونوں نظموں میں آواز (یا چیخ) جو کہ بے سود ہے ایک نئی سمت کے سفر کا اشارہ ہے۔''(2)

مجید امجد اپنی نظم میں زندگی کا صرف ایک رخ نہیں دکھاتے، بلکہ کئی پہلوؤں سے اس کو کرداری صورت میں متشکل کرتے ہیں۔ اس نظم ''پکار'' (۸۔۱۹۵۸) کے باطن میں زندگی اور موت کا خوف رواں ہے جو آگے چل کر اس کی نظم ''موانست'' (۱۴۔۹۔۱۹۶۸) میں انسانی سایے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ جو کہ درحقیقت ایک چمن کا

مالی ہے۔ اپنے معمول کے وقت سے پہلے وہ چمن میں داخل ہوا ہے جس کو دیکھ کر وہاں بیٹھی ایک کوئل جو اس چمن کے ماحول سے مطابقت حاصل کر چکی ہے۔ وہ چیخ اٹھتی ہے لیکن جلد ہی اس پر آشکارا ہو جاتا ہے کہ یہ تو وہ مالی بن چکا ہے (shadow) ہے جس سے وہ مانوس ہے۔ اس لیے وہ کوئل دوبارہ سے سو جاتی ہے۔ اس دور میں انسان اورموت بھی سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتی ہے، لیکن انسان اس سے بے خبر رہتا ہے۔ جب نظم ‘‘موانست’’ میں کوئل کا کردار جو نئے دور میں جنگلوں کے بجائے چمنوں میں رہنے پر مجبور ہے۔ یہ درس دیتا ہے کہ ہمیں موت سے مانوس ہو جانا چاہیے۔ تاکہ بدتر صورتحال کے لیے تیار ہو سکے۔ انگریزی شاعری میں کیٹس کی نظم "Ode to the Nightingale" میں کوئل کے کرداد کے ذریعے زندگی کے مختلف مدا ر ج بیان کیے گئے ہیں۔ چوتھے بند میں وہ ہر چیز کو فنا کی لپیٹ میں دیکھتا ہے کہ کوئل کی قوتِ سماعت بھی ختم ہو جائے گی۔پانچویں بند میں وہ کوئل کے گیت کو غیر فانی سمجھتا ہے کہ اس کے فنا ہو جانے کے بعد بھی اس کا گیت باقی رہے گا۔ جس کو زمانہ قدیم سے بادشاہ اور دوسرے لوگ سنتے چلے آئے ہیں۔ چھٹے بند میں راوی کا کردار اندھیرے میں اس کوئل کے گیت سنتا ہے اورموت کے ساتھ ساتھ محبت بھی اس کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ وہ تو مر جائے گا لیکن کوئل گیت گاتی رہے گی۔ آخری بند میں یہ کردار کوئل کی آواز بھی نہیں سن پاتا۔ کوئل کا کردار پراسراریت کی دھن میں کھو دیتا ہے۔ مجید امجد کی نظم (موانست) اور موت مشترکہ اکائی ہے۔ کیٹس کی نظم میں کوئل کا کردار انسانی زندگی کی فنا اور عمر کے لمحہ بہ لمحہ بڑھاپے کی طرف جانے کا الم ملتا ہے۔ یہ سب کچھ انسانی داخلی کیفیات کوئل کے نغمے کے اندر رچی بسی ہیں۔ اس ضمن میں www.sparknotes.com/poetry/keats میںیوں رائے قائم کی گئی ہے:

"In this Ode, the transience of life and tragedy of old age is set against the eternal renewal of the nightingale's fluid music."(3)

"مجید امجد کی نظم موانست اور کیٹس کی نظم۔ Ode to the nightingale" کی مشترکہ کردار کی کوئل کے میں خصوصیت یہ

ہے کہ دونوں آخر میں فنا کے ساتھ مانوس احساس اجاگر کرتے ہیں۔

مجید امجد جسمانی لحاظ سے شجر ہے تو اس کی جڑیں تہذیبی ورثے میں گہری ہیں۔ اس کی روح نے جب فکر کے ساتھ مل کر تخیلاتی پرواز کی ہے تو پرندے کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ یوں وہ پا بہ گل ہونے پر پابند بھی ہیں۔ اور پرندے کی صورت میں آزاد بھی۔ مجید امجد نے زندگی کی (Freewill) کو جب جسم کے اندر دیکھنا چاہا تو ایک انجانا خوف موت کا پیغام لے کر اس کے سینے میں اترا۔ اسے لگا تو وہ معصوم چڑیا کی طرح دنیا کے روزن میں بیٹھا ہے۔ اپنی تنہائی کے پل کو غور سے دیکھتا ہے۔ اپنی ذات کے باطن میں گم ہے۔ اور خارج میں موت کی ڈائن آنکھیں جو بلی کی بھی ہو سکتی ہیں اس پر جھپٹنے کو تیار ہیں۔ اس لیے وہ اس معصوم چڑیا کو اڑ جانے کو کہتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

بھولی، تو یوں اڑتی ، پنکھ جھپکتی ،

یہاں کہاں آ ٹھہری ، چڑیا، اے ری چڑیا

یہ تو میرے دل کا پنجرہ ہے تو اس میں

اپنی ٹوٹی پھوٹی خوشیاں ڈھونڈنے آئی ہے؟

پگلی ، یہاں تو ہے ہیرے کی کئی کاچوگا

اور اک زخمی سانس اس پنجرے کی انگنائی ہے

اڑ اور مہکی ہوئی بن بیلڑیوں میں

(4) !جا چن لے ، ری چڑیا ، اے ری چڑیا

یہ چڑیا ایک آزاد زندگی کی علامت ہے جو مجید امجد کے دل کے اندر روح بن کر اتر آئی ہے۔ اور اس دل کے اندر تو ہیرے کی کنی جیسی صلاحیتیں ہیں۔ ان صلاحیتوں کے ہمراہ صرف اپنے باطن میں ہی زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ بلکہ خارجی دنیا میں انسانی انا کو معاش کی مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ اس لیے مجید امجد اپنی زندگی کو خارج میں مصروف عمل ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن ان کی اڑان ان کو روحانی کے سفر میں آگے بڑھا تی ہے۔ پرندہ جتنا بھی آسمان کو چھو لے اسے خوراک کے لیے زمین پر اترنا پڑتا ہے۔ اوریہی خوراک اس کے لیے موت کا باعث بن جاتی ہے۔ ممکنات کے اس پیچیدہ نظام میں شاعر کی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

اس نظم میں مجید امجد نے خود کو ایک چڑیا کے روپ میں دیکھا ہے جس پر ڈائن کی آنکھ مرکوز ہے کہ جیسے ہی " موقع ملے، وہ اسے چھٹ کر لے جائے۔ گویا شاعر دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک چڑیا کے روپ میں جو معصومیت اور بے خبری کی علامت ہے اور دوسرا خوف کی زد پر آئے ہوئے انسانی روپ میں جسے معلوم ہے کہ باہر موت کی ڈائن کی آنکھیں اس کے انتظار میں ہیں۔"(5)

میں (Ecosystem) مجید امجد پرندے کے کردار میں روحانی و جسمانی دونوں طرح آزادی کے خواہاں ہیں۔
جب ایک چیز فطرت میں شکار کرتی ہے تو خود بھی شکار بن جاتی ہے۔ یہاں زندگی جن خوشیوں کی خاطر دنیا میں آ گئی ہے۔ اسے موت کا شکار بھی بن جانا ہے۔ جبکہ ایک نظم "بہار کی چڑیا" (۲۰۔۱۔۲۹۶۹) میں ایک اور باغی صورتحال سامنے آتی ہے۔ یہاں چڑیا گھر کے روزن میں گھونسلا بنائے اپنے منگیتر کے ساتھ خوشیاں تلاش کر رہی ہے۔ لیکن اس کے کمرے میں موجود آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اس کو اپنی رقیبہ سمجھتی ہے جو اس سے اس کا منگیتر چھیننا چاہتی ہے۔ وہ اپنے اس عکس سے لڑ لڑ کر اپنے اندر کے خوف سے لڑ رہے ہیں۔ مجید امجد کے خیال میں یہ بغاوت اپنے آپ سے لڑنے کے بعد وجود میں آتی ہے۔

اشعار پہ غورکیجیے:

کون ہے پہلے سے یہ بیرن، جھپٹ جھپٹ کر، اس نے اس چہرے پر کالک مل دی

اور اب وہ اور اس کا منگیتر دونوں

گلے پھلا کر ، کتنے تاؤ میں اس بے عکس آئینے کے آگے بیٹھے ہیں

(6) باغی، جو ہر دور میں اپنے سائے سے لڑنے آتے ہیں

پرندے کی صورت میں بغاوت کا حوالہ بھی آزادی کی ایک صورت ہے۔ ان پرندوں کی صورت میں مجید امجد ایسی آزادی کا تصور کر رہے ہیں کہ جس میں ایک فضا، ایک ہوا اور ایک زمین پر رہتے ہوئے کسی سرحد کی پابندی نہ ہو۔ یہ عالمی بھائی چارے کا تصور ہے جس کے اندر قدرتی ماحول میں قوانین کے تحت آزاد اور جس حد تک ممکن ہو خودمختار انسان پروان چڑھ سکے۔ اس انسان کو یہ خود مختاری اس کے خدا نے سوپنی ہے کہ گناہ اور نیکی کرنے کے لیے اس کو مکمل اختیار دے دیا ہے۔

کا حصہ بنے اس کو (Ecosystem) اگر وہ قدرتی ماحول میں صحت مندانہ زندگی گزارنا چاہتا ہے تو وہ اس تہہ و بالا نہ کرے یہ آزادی کا تصور اور قدرتی ماحول میں زندگی اور موت کی آویزش زیادہ واضح صورت میں نظم ''افریشیا'' (۲.۱.۱۹۶۶) میں ہجرت کرنے والے پرندوں کے کردار میں نظر آتی ہے۔ افریشیا میں موسم سرما میں ہجرت کر کے صرف تھوڑی سی جھیل کی خوراک کے لیے کتنے فاصلے طے کر کے آتے ہیں۔ ان میں کئی زندگی کی بقا کی جستجو میں کسی گولی کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ موت یہاں بھی ایک شکاری کے روپ میں بیٹھی ہوتی ہے۔ اس مکمل آزادی میں صرف قدرت کی جبریت قائم رہتی ہے۔ ان اشعار پر غور کیجیے:

اور _____ پانیوں پہ بہتی ہوئی سنسناہٹوں میں

لہراتے پنکھ، ابھرتے کماندار زندہ چوکس

آزاد آبناؤں میں جیتے ہیں جینے والے،

(7) ٹھنڈی ہوا کی باس میں، بارود کے دھوئیں میں

فطرتی آزادی کا بین الاقوامی تصور مقامی سرحدوں کے اندر حاصل کیا گیا ہے۔ آزادی اور آزادی کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کی کرداری پیش کش نظم ''مینا'' (۱۴.۱۲.۱۹۶۹) میں کی گئی ہے۔ اس نظم میں ''مینا'' ایک علامتی کردار ہے۔ جو کہ ہندوستان میں آزادی اور زندگی کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ جب یہاں ہندوستان کو انگریزوں نے اپنی کالونی بنا رکھا تھا تو یہاں کے لوگوں کی زندگی ایک ایسی مینا کی طرح تھی۔ جو چاندی کے پنجرے میں قید ہو۔ وہ وقت لوگوں کے لیے اب بھی یادگار ہے۔ لیکن انگریزوں کی جبریت، انگریزوں کا بنایا ہوا نظام تھا کہ جس کے پنجرے میں اس کی تہذیبی اور روحانی آزادی کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس قید میں بھی لوگوں کو خبر نہ تھی کہ بعض لوگ انگریزوں کی عنایات کے نیچے شراب و کباب اڑانے میں مصروف تھے۔ ان کا آب و دانہ انگریز کہاں سے حاصل کرتے تھے۔ ان کو خبر بھی نہ تھی کہ یہ کئی مجبور و غریب غلاموں کی کھوپڑیاں سر تن سے اتار دیتے اور اس کے بدلے نوابوں کو زندگی کی بقا کے لیے رزق ملتا۔ ان ہی غلام لوگوں میں آزادی کی مینا کے دماغ میں جو انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی چنگاری پیدا ہوئی تو انھوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے نام پر اس آزادی کی مینا کی روح کو قتل کر ڈالا۔

اب اس آزادی کو حاصل کرنے والے لوگوں کے جسم اور خواب بھی فنا ہو چکے ہیں۔ اور اس بے روح آزادی کی مینا کو تو وہی قاتل اچھے لگتے ہیں۔ جنھوں نے آزادی کے نام پر زندگی کا قتل عام کر دیا۔ اب یہ آزاد مینا پاکستان میں سیاسی سماجی جبریت کے ہاتھوں اڑنے کے قابل بھی نہیں رہی اور اس آزادی کی مینا کے لیے تو وہی چاندی کے پنجرے میں رہنے والے دن یاد گار ہیں۔ اور وہی قاتل اچھے ہیں جنھوں نے اسے اس پنجرے سے آزاد کیا۔ اشعار پر نظر ڈالیں:

اب جب تلواروں کی نوکیں تیرے گلے پر رکھ کر تجھ کو پیار بھری نفرت

سے یوں چمکارنے والے

اپنے جسموں کی مٹی میں خواب فنا ہیں

میری باتیں سن کر، مجھ کو ٹک ٹک دیکھنے والی، چوکور آنکھوں والی، مینا

ہاں وہ قاتل اچھے تھے نا،

اب تجھ کو وہ دن یاد آتے ہیں نا،

اب اس وادی کی بھر پور گھنی سبز لتا میں اڑنا اور یوں راتب چننا کتنا

مشکل ہے!

اب یوں اڑنے میں تیرے پر دکھتے ہیں نا، مینا! (8)

یوں اس نظم میں مینا پاکستان کے اندر انسان کی آزادی پر سیاسی سماجی جبریت کو ظاہر کر رہی ہے۔ یہ ایک ایسی کرب ناک صورتحال ہے جس میں زندگی صحرا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تخلیقی بنجر پن کی وجہ سے ذہنی شعور کی نشونما رک جاتی ہے اور عوام الناس کوایک مخصوص طبقہ اپنی جبریت میں چیونٹیوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عامر سہیل:

مجید امجد کے ہاں ‘‘پرندے’’ کی علامت زندگی کی جبریت کا اشارہ بھی دیتی ہے۔ تاہم یہ جبریت ایک سطح پر موت ‘‘ ہی کے موضوع کا ایک عکس ہے۔ زندگی اپنی تمام تر آزادیوں کے باوجود جبر کا شکار ہے۔ کیونکہ آزادی اپنے طور پر ایک جبر ہے بالکل اسی طرح جیسے زندگی گزارنا اور زندہ رہنا۔ مجید امجد نے زندگی کے اس جبر کو پرندے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ نظم ‘‘مینا’’ اسی جبریت کا بنیادی حوالہ ہے۔’’(9)

اسی زندگی جو قدرت کی حدود میں رہتے ہوئے ایک متحرک آزادی سے عبارت ہے جب سیاسی و سماجی اور معاشی جبر کے نیچے پس جاتی ہے تو نہ صرف انسان کے احساسات و جذبات اور رویوں میں نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ بلکہ انسان کے کرداری اوصاف انسانی سطح سے نیچے گر جاتے ہیں۔ یہیں سے انسان رنگ و نسل، مذہب، امارت اور

غربت کی دنیاؤں میں الگ الگ قید کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کے سفر کا راز صرف یہ رہ جاتا ہے کہ انسان بس ایک دائرے میں ہی گھومتا ہوا مر جائے۔ اسی تصور کی مختلف جہات کو پیش کرتے ہوئے مجید امجد کی شاعری میں انسان کے ہمراہ جانوروں کے کردار بھی تراشے گئے ہیں۔

حوالہ جات

1 کلیات مجید امجد، بن کی چڑیا، ص:۹۳

2 سید عابد سہیل، ڈاکٹر، مجید امجد نقش گرناتمام، ص:۳۳۲

3 www.sparknotes.com/poetry/keats/section3/themes.html

4 کلیات مجید امجد، اے ری چڑیا، ص:۵۱۰

5 وزیر آغا، ڈاکٹر، مجید امجد کی داستانِ محبت، ص:۱۰۲

6 ایضاً، بہار کی چڑیا، ص:۵۱۱

7 ایضاً، افریشیا، ص:۴۴۷

8 کلیات مجید امجد، مینا، ص:۵۴۶۔۵۴۵

9 سید عامر سہیل، ڈاکٹر، نقش گرنا تمام، ص:۳۳۸